ارشد چہال کے ناول "دھندلے کوس" کا ڈیکولا کا نظریۂ علمِ موجودات اور شناختوں کے اصول کے تناظر میں تنقیدی جائزہ

Critical Analysis of Arshad Chihal's Novel

سدرہ اختر * ، ڈاکٹر فرحت جبیں ورک **

Abstract:

The dualism of culture and nature has been playing a pivotal role in the construction and reconstruction of human life. Arshad Chahal in his famous novel ''Dhondle Kos'' meticulously presents this inescapable and complex interplay of nature and culture in Pakistani society while considering them fundamental markers of intersectionality. Arshad Chahal further exposes various social and environmental factors as imperative constituents of the cosmological scheme that proved to be instrumental in constituting the individual's identity in a particular socio-cultural system.Culture, nature and the environment are very important for human life. Arshad Chahal has presented environmental, cultural and natural elements in his novel Dhandle Kos. Nature is independent, Culture grows with nature. Yes, they are known by their culture. Nature has provided the means of subsistence for man. If man, instead of being its companion, starts harming it, then he reaches its revenge. Nature and culture are fundamental in the environment. While critically evaluating the proposed novel in the light of Philippe Descola's ideas, it is important to identify the main principles of epistemology

* ایم فل سکالر، شعبہ اردو زبان وادب، فاطمہ جناح ویمن یونی ورسٹی، راولپنڈی

** چیئرپرسن، فیکلٹی ایڈوائزر، شعبہ اردو زبان وادب، فاطمہ جناح ویمن یونی ورسٹی، راولپنڈی

and identity. According to theoretical research, the French author Philippe Descola's theory of philosophical anthropology is presented. In this regard, Descola offers principles of identification and relation as well.

فطرت اور ثقافت صرف دو لفظ نہیں بلکہ یہ آفاقی حقیقت بیان کرنے کے دو تصورات یا نظریے ہیں۔ یہ حقیقت چیزوں کی بناوٹ کے لحاظ سے اپنا خاص نظام رکھتی ہے۔ بہت سی تہذیبوں نے وجودی عناصر کی خصوصیات کو اپنے مخصوص انداز میں ڈھالا ہے۔ علم اور صلاحیت کے اعتبار سے دنیا کے اجتماعی اجسام کو انسانی و غیر انسانی کے روپ میں جدا کر دیا جاتا ہے۔ یہ نظام تسلسل اور تضاد کی تنظیم سے وجود میں آتا ہے۔

علم بشریات اور ادب کی آمیخت سے حقیقتوں کی اصیل صورتوں تک رسائی کی جانی اہم ہے۔ جو کہ علمِ موجودات کی ہی بدولت ہے، جو علم بشریت سے تجزیاتی اور علمی سطح پر دنیا اور اسی کی موجودات کا بہتر مطالعہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس میں موجودات کی اصناف، ان کی وجودیت اور انواع واقسام کو پرکھا جاتا ہے تاکہ معلوم ہو سکے کہ ان میں موزونیت اور غیر موزونیت کے کون کون سے عناصر پوشیدہ ہیں۔ علمِ بشریات اس مقصد کے حصول کے لئے اپنی تمام مہارت اور لگن کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہے کہ دنیا کس طرح معرض وجود میں آئی اس کے بننے میں فطرت اور ثقافت نے کس طرح علمِ موجودات پر اثر ڈالا، ادب اور سماجی علوم کی امیضت سے اس کا اظہار کس طور ہوتا ہے۔ تجزیہ نے ثابت کیا ہے کہ دنیا امتیازی عمل کا دوسرا نام ہے۔

"اس دنیا کی بنیاد ہی اختلاف عمل پر ہے باہمی تعاون اور مختلف پیشوں اور کاموں کے ذریعہ سے یہ دنیا چل رہی ہے۔۔۔ غرض اس دنیا کا نظم و نسق ان مختلف اصناف کے وجود اور قیام ہی پر موقوف ہے۔"(۱)

انسان علمی و حسی سطح پر رجحانات و رویے کا مواخذہ کرتا ہے۔ انسانوں میں پایا جانے والا امتیاز ثقافتی تغیر کہلاتا ہے۔ یعنی کسی بھی انسان میں صلاحیتوں کا فقدان نہیں ہوتا یہی وجہ ہے کہ اگر امتیازات و افتراکات نہ ہوں تو صلاحیتیں کبھی ممتاز مقام نہ پا سکیں۔ چیزوں کی شناخت، طرزِ عمل اور ان کے تعلقات سے ہی خصوصیات امتیازی وصف کی حامل ہوتی ہیں۔ ہر انسان چیزوں کو ایک نقطہ ء نظر سے نہیں دیکھتا، وہ ہر معاملے کی نوعیت کا ایک طرح سے تجزیہ بھی نہیں کر سکتا، کیونکہ انسان کی پسند ناپسند ہی بنیادی وجہ ہے کہ جو چیزوں اور موجودات کو دیکھنے میں اختلاف پیدا کرتی ہے۔ انسانوں کی سوچ، خیال، رائے اور نقطہ ء نظر ہمیشہ جدا ہوتا ہے مگر بعض اوقات کچھ خاص جہتوں کے حوالے سے ان میں اشتراک کا عنصر بھی سامنے آجاتا ہے مگر وہ ایک الگ بحث ہے۔

عصرِ حاضر کے مطابق موجودات میں اختلافِ رائے رکھنا ہی علمی تغیرات کے دائرہ میں آتا ہے۔ فلسفیانہ

رجحان کی یہ جہتیں سائنس اور فطرت کے علوم اور ثقافت و ادبی مباحث کی مختلف شاخوں کے مابین تفریق کا باعث بنتی ہیں جو آفاقی و زمانوی سطح پر تبدیل ہو کر ثقافت کا حصہ اور ادب کا موضوع بنتی جاتی ہیں۔یہی انفرادیت، تعبیر، تغیر، مشابہت، لفظی و معنوی اشتراک، توقعات، پیمائش، ادبی متون کے بین السطور فرحت اور پیشن گوئی کے زمرے میں آتی ہیں۔ قدیم دور سے ہی انسان اور غیر انسان کا تعلق ان تمام جہتوں سے عبارت ہے۔انسان ماحول میں رہ کر اسی کا حصہ بن جاتا ہے۔بظاہر وہ بغاوت کرے بھی تو اس تقسیم کی وجہ سے خود کو ماحول سے جدا نہیں کر سکتا بلکہ فرار کے بعد بھی وہ اسی ماحول کا حصہ رہتا ہے۔ تمام افزائشی اور حیاتیاتی حقیقتیں ثقافت میں اپنا کردار ادا کرتی ہیں۔ فلپ ڈیکولا اس سلسلے میں خاصی اہمیت کا حامل ہے۔وہ کہتا ہے کہ دنیا کے لئے ماحول ایک ایسا عمل ہے جو اسے باطن سے محسوس کر سکتا ہے اور اس کی خارجی و داخلی جہتوں تک رسائی حاصل کرنے کی کما حقہٗ خاصیت رکھتا ہے۔

> "Ontology is taken here as designating a more elementary analytical level to study wording than thaw own anthropology, usually calls for it."(2)

انسانی ماحول نے دنیا کو مختلف ثقافتوں سے نوازا ہے۔وہ لوگ جو تاریخ پر سوال اٹھا کر اسے پھر سے اخذ کرتے ہیں، پہلے سے موجود ثقافتوں میں ماحولیاتی عناصر تلاش کرتے ہیں۔آج علمِ موجودات کے حوالے سے اسے پیشن گوئی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔دنیا کی تمام موجودات کسی معاملہ یا تعلق کو ظاہر کرتی ہیں۔دنیاوی عمل تصادمی طور پر وقوع پذیر نہیں ہوتا بلکہ اس کے پس منظر میں موجودات کی حقیقتوں کی بے شمار جہتیں ہیں۔علم موجودات دراصل ماحولیاتی عناصر میں تفریق کا موجب ہے۔دنیا میں اگر یکسانیت رہتی تو یہ اب تک موجودہ صورت میں نہ ہوتی۔اس کا امتیاز و تفریق ہی ان حقیقتوں کو جنم دیتا ہے جس سے اس کا نظام چل رہا ہے۔ بعض اوقات ہم جن چیزوں کی تفریق کرتے ہیں دوسرے کے لئے اس میں تفریق کی گنجائش نہیں ہوتی۔دنیا کی خوبصورتی مختلف نقطہ نظر سے قائم ہے۔ماحول کی مطابقت و موزونیت اس کے عناصر کے تعلقات پر انحصار کرتی ہیں۔ علم موجودات ہی ان حقیقتوں میں فرق دیکھنا سکھاتا ہے۔دراصل یہ مادی و غیر مادی مواد ازل سے ہی ایسا نہ تھا جسے ہماری استطاعتوں نے اپنے ڈھانچے میں ڈھال لیا، بلکہ اس جھُنڈ میں سے انسان نے کچھ اختیار کر لیا اور کچھ کو نظر انداز کر دیا۔ دنیا کی یہ خوبصورتی بے ترتیبی میں پوشیدہ ہے۔اس کی نمایاں خصوصیات پکار رہی ہیں کہ انسان فطری حسن کی قدر کرے۔ علم بشریت کا ترغیب کردہ یہ نظام غیر معمولی گہرائی تک جانے کا متقاضی ہے۔

ماہرِ بشریات ڈیکولا، کا پیش کردہ علمِ موجودات کا نظریہ اس بات پر زور دیتا ہے کہ تضادات کا نظام کائنات کو آفاقی سطح پر متاثر کرتا ہے۔انسان کے رہن سہن کے نظام میں تضادات کا نظام کائنات کو آفاقی سطح پر متاثر کرتا ہے۔انسان کے رہن سہن کے نظام میں تضادات اداروں، معاشی نظام، اقدار، ثقافتی تغیرات، متعلقہ نقطہ نظر کی بدولت رونما نہیں ہوئے۔بلکہ یہ نظام قیاس کرتا ہے کہ کائنات کے تمام اجزاء اور اس کے ضروری لوازمات کس طرح جڑے اور ان میں تعلق کا آغاز ہوا۔

> "There framing devices used by the octants to make sense of a situation and manage the fine tuning of what could be Calles interagency." (3)

بشریات" کی اصطلاح خاصی غیر معمولی ہے۔یہ ادب کے موضوعات، زندگی، ماحول، فطرت سب کے لئے اہم ہے۔ڈیکولا کا نقطہء نظر یہ ہے کہ ہمیں گہری سطح پر انسانی تنوع کی جڑوں کو تلاش کرنا چاہیے۔دنیا کیسے بنی اور انسان کا دنیا سے کیا تعلق ہے۔علوم بشریات کا بنیادی مقصد ہے کہ انسان اور غیر کس طرح ماحول میں رہتے ہیں وہ کس طرح مخصوص رہن سہن کے لئے ماحول یا فطرت کو تبدیل کرتے ہیں اور فطرت کو اپنے تابع کرنے کے لئے کیا اقدامات اٹھاتے ہیں۔ردِ عمل کے طور پر کیا ترجیحات سامنے آتی ہیں اس لاتعداد تنوع میں مادی و غیر مادی یا انسانی و غیر انسانی تعلقات نمو پاتے ہیں۔لہذا علم بشریات کلچر، ثقافت، رہن سہن، عادات، تضادات اور آپس میں منفی و مثبت تعلقات سے عبارت ہے۔ہمیں گہری سطح پر انسانی تنوع کی جڑوں کا کھوج لگانا ہوگا۔ادبی متون اسی کا جواز پیش کرنے میں اہم ہیں۔دنیاوی نوعیت سے حادثاتی و غیر حادثاتی فکریں بر آمد ہوتی ہیں۔علمِ موجودات اس امر کا جائزہ لیتا ہے کہ انسان ماحول میں کس طرح کام کرتے ہیں وہ ماحول کو اپنے تابع کرتے ہیں یا خود ماحول کے تابع ہو جاتے ہیں۔ان کے درمیان ایک مستقل تعلق قائم ہو جاتا ہے لیکن یہ تعلق مائل بہ تغیر ہے۔تنوع کا اس عمل میں اہم کردار ہے۔ان رموز کو سمجھنے کے لئے اور تعلق کی بہتر انجام دہی کے لئے باضابطہ دائرہ کار یا فریم ورک بنانے کی ضرورت ہے۔

علمِ موجودات میں انسان، جانور، پودے، چرند پرند، پہاڑ، ندی، ہوا، زمین، فضا سبھی شامل ہیں۔اس علم کی نوعیت موزونیت اور غیر موزونیت پر منطبق ہے۔ان کی پرکھ سے ہی ان کی حقیقت پسندی آشکار ہوتی ہے۔اس کا کام ہے کہ وہ کھوج لگائے کہ دنیا کی تشکیل وارتقاء کیسے ہوا؟انسانی عمل و سوچ کے مختلف انداز اس کا حصہ ہیں جو علمی، حسی اور عملی حیثیتوں سے مربوط ہیں۔

یورپی مفکرین نے انسان اور فطرت کو دو الگ الگ رجحانات قرار دیا۔جبکہ فرانس کالج کے پروفیسر فلپ

ڈیکولا نے فطرت اور انسان کے درمیان تضاد قائم نہیں کیا۔ بلکہ دونوں کو مربوط قرار دیا۔ دونوں کا عمل، علمی و حسی رجحان ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتا ہے۔ انسان اور غیر انسان ماحول کے لئے مل کر کام کرتے ہیں جن میں تضادات سماجی زندگی سے حاصل ہوتے ہیں۔ سوچ، نظریات، عقائد خیالات ان علمی و حسی نوعیتوں کو ترتیب دیتے ہیں۔

"They manage to transform this environment by weaving with it and between them" (4)

یہ فطرت بنانے کا عمل ہی ہے کہ جو عناصر کو اکٹھا کر کے زندہ رکھتا ہے یا پھر انہیں الگ کر دیتا ہے دراصل یہ عناصر کی مشابہت اور غیر مشابہت پر منحصر ہے۔ علمی عملیہ مادی وسائل کی آگاہی سے اپنے مخصوص مزاج اور عادت سے انہیں الگ مقام عطا کرتا ہے۔ جو انہیں خارجیت اور داخلیت کے نام دیتا ہے۔ مادی وسائل خارجی و داخلی سطح پر کام کرتے ہیں۔ ماحولیاتی تنقید اسی سے عبارت ہے۔

"ماحولیاتی تنقید کا ایک اور وظیفہ یہ تجزیہ کرنا بھی ہے کہ ہر مصنف نے فطرت کے ساتھ پیچیدہ رشتوں کی تفہیم کے لیے راعیانیت جیسی اصناف اور اسالیب کی بہتر تشکیل (ماضی کی نسبت) کیسے کی ہے۔"(۵)

داخلی و خارجی مادی انسان کو الگ نہیں کیا جا سکتا۔ انسان داخلیت و خارجیت کے تسلسل پر زور اور تضاد کو کم کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

ہمارا "شعور" حیات کی اہم ترین خاصیت ہے۔ انسان کا طبعی جسم مادے کی حیثیت رکھتا ہے۔ علم موجودات کو ان نوعیتوں کی بنیاد پر دس ضابطوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ جن میں چار اصول شناخت (Identification) پر مشتمل ہیں اور چھ اصول رشتوں، تعلقات (Relations) کی نمائندگی کرتے ہیں۔ فلپ ڈسکولا کے فریم ورک میں چار بنیادی مباحث علم موجودات کے توسل سے سامنے آتے ہیں۔ جن میں اول "صنفی تضاد" (Animism)، دوم "فطرت پسندی" (Naturalism)، سوم "صنفی اشتراک" (Totemism)، چہارم "مشابہت" (Analogism)۔

صنفی تضاد حقیقت کی نشاندہی کرتا ہے کہ داخلیت ایک ہی ہے مگر ان عناصر کی صنف اور خارجی ڈھانچے میں تضاد موجود ہے۔ یہ روحوں کا تسلسل اور جسم / مادہ کا تضاد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خارجی سطح پر یہ متضاد حیثیت کے حامل ہیں۔ جو اندرونی طور پر ایک جیسے احساسات رکھتے ہیں۔ افریقہ، شمالی امریکہ، سائبیریا اور جنوبی ایشیا کے مخصوص علاقوں میں رہنے والے لوگ پودوں، جانوروں اور دیگر طبعی عناصر کو اپنی روح سے جدا نہیں کرتے۔ ان کے نزدیک جو احساسات ہم پر بیت رہے ہیں، جانور، پودے بھی اس کو محسوس کرتے ہیں۔ لہذا اندرونی اشتراک ہے مگر صنفی تضاد

ہونے کے سبب Animism یا صنفی تضاد میں شمار ہوتے ہیں۔

"Animism as a continuity of souls and a discontinuity of bodies" (6)

پودے، جانور اور دیگر فطری عناصر انسان سے ظاہری مطابقت نہیں رکھتے۔ سب کا طبعی ڈھانچہ جدا ہے مگر انسان ان سے دوستانہ تعلقات رکھتا ہے۔ وہ ان کا آپس میں تبادلہ(exchange) اور کٹھن وقت پر ان سے ہمدردی رکھتا ہے۔ یہی وہ عناصر ہیں جو داخلی طور پر انسان کو فطرت کے نہایت قریب کرتے ہیں کہ وہ اپنی ذات کو ان عناصر میں محسوس کرتا ہے۔ ان سے اپنے احساسات کو بانٹتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ دیہاتوں اور صحراؤں میں رہتے ہیں جہاں دنیاوی اخلاقیات و اقدار حاوی نہیں ہوتیں۔ یہ ایک دوسرے سے لین دین میں مصروف رہتے ہیں۔ تاہم ہمدردی اور انسانیت کائناتی صداقتیں ہیں۔ انسان کائنات کا جزو یا نوع نہیں بلکہ کائنات کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔ دوسرے لفظوں میں انسان اور تمام انواع غیر انسانی جن سے انسانوں کا سابقہ پڑتا ہے، مادے اور طبعی صورت میں جدا ہیں۔ مگر داخلی و روحانی اعتبار سے ان کے درمیان مطابقت پائی جاتی ہے۔ عمومی ماحولیات، انسان اور غیر انسان کو تعلقات کے بندھن میں باندھتے ہیں، جو مخصوص ثقافتی نظریہ رکھتے ہیں۔ جانوروں، پودوں اور دیگر ماحولیاتی عناصر کی مخصوص فطرت ہوتی ہے۔ انسانوں کی طرح ان کی بھی ثقافت ہوتی ہے۔ یعنی شناخت، ثقافت اور ظاہری/ طبعی صورت کی محتاج ہے۔ انسانوں اور غیر انسانوں کی ثقافت دراصل داخلی شراکت داری کی مرہون منت ہے۔ مگر دنیاوی نظر میں یہ ایک نہیں بلکہ جدا جدا ہیں۔ ان کی ضروریات میں اختلاف ہے۔ حیاتیاتی سامان وضروریات جانوروں اور پودوں کو ایک دوسرے پر غلبہ پانے پر مجبور کرتی ہیں۔ وہ اپنی انفرادی زندگی رکھتے ہیں جو دیگر فطری عناصر پر اثر انداز نہیں ہوتی۔ دوسری جانب مغربی تصور یہ بھی قبول کرتا ہے کہ اگرچہ انواع داخلی طور پر ایک ہوتی ہیں جیسے تمام مچھلیاں چاہے رنگ ڈھنگ میں مختلف ہوں ایک ثقافتی انداز اپناتی ہیں۔ پانی میں تیرنا، کھانا، نشوونما ایک ہی ہے۔ اندرونی طور پر یکساں مگر ساخت میں جدا ہیں۔ غرض یہ ماحول کی نمایاں خصوصیات ہیں کہ عمل تولید، افزائش، خوارک اور نقل و حرکت میں شراکت دار ہیں اور داخلی اعتبار سے مساوی ہیں۔ صنفی تضاد کی اصطلاح کو انگریزی میں اینیم ازم کہا جاتا ہے جو لاطینی لفظ "اینما" سے نکلا ہے جس کا اردو مطلب روح ہے۔ لہذا اس کے پیش نظر کائنات کے تمام مظاہر کی ایک "روح" ہے۔ یعنی ہوا، پانی، زمین، جانور، پودے، پہاڑ سبھی میں روح موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس اندرونی احساس کی وجہ سے انسان، غیر انسان کو خود سے جدا نہیں کرتے بلکہ ان پر آنے والی اچھی بری تبدیلی اور مظہر کو اپنی ذات میں محسوس کرتے ہیں۔ صنفی تضاد کو ماننے والے مادی و غیر مادی ہر شے کی روح کو محسوس

کرتے ہیں۔اس کے ماننے والے یہ دعوی کرتے ہیں کہ اگر انسان میں جان ہے تو سنگ و خشت، چرند پرند، ندی و کہسار، ریگستان و بیابان سبھی میں جان موجود ہے۔

ان شناختوں میں دوسرا اصول "صنفی اشتراک/کلیت پسندی "Totemism ہے۔اس کی مترادف اصطلاح ٹوٹی ازم ہے۔جو لفظ ٹوٹم "سے نکلا ہے جس کے معنی "عقیدہ" کے ہیں۔ڈسکولا کہتا ہے:

> "The second mode of identification, where some beings in the world share sets of physical and moral attributes that cut across the boundaries of species. I call it totemism. " (7)

اس میں اندروں و بیروں ایک مسلسل عمل جاری ہے۔اور یوں اندر اور باہر دونوں لحاظ سے ہم ایک جیسے ہیں۔ٹوٹی ازم (Totemism) کے لئے "کلیت پسندی" کی اصطلاح بھی استعمال ہوتی ہے، کلیت پسندی روحانی عقیدے کا نظام ہے جس میں انسان غیر انسانوں سے ایسا رشتہ قائم کرتے ہیں جو مضبوط اور اٹوٹ ہو۔روحانی طاقت اس قدر حاوی ہو جاتی ہے کہ صنف تضاد کے باوجود امتیاز مٹ جاتا ہے۔اور انسان اپنی ذات کو غیر انسان کا حصہ ماننے لگتا ہے، اس رشتے میں وہ اس قدر آگے بڑھ جاتا ہے کہ تمام مذہبی، روحانی قوتوں کو اس کے ساتھ مربوط کر لیتا ہے۔اس طرح توہم پرستی، ضیعف الاعتقادی، باطل پرستی، جادو پرستی اور توہماتی نظریات اس کو پروان چڑھاتے ہیں۔

ہندوستان کے مختلف قبیلے آج بھی اس شناخت کے اصول کو ماننے والے ہیں۔جنوب مغربی آسٹریلیا میں کلیت پسندی قدیم دور سے چلی آرہی ہے۔کلیت پسندی عقیدے کا وہ نظام ہے جس میں انسان کا رشتہ غیر انسانوں کے ساتھ روحانی، صوفیانہ اور متصوفانہ ہو جاتا ہے۔یہ رشتہ جانوروں، پودوں، درختوں، پہاڑوں، ہوا سے اس طرح قائم ہوتا ہے کہ انسان انہیں اپنا پیشوا "ٹوٹم "بنا کر تمام صنفی تفریق بھلا کر اسی کا حصہ بن جاتا ہے۔یہ فطری و غیر انسانی عناصر ایک استعارہ یا علامت بن کر اس کے ذہن و قلب کو اپنے سحر میں لے لیتے ہیں اور اس طرح وہ ایسے رشتے میں بندھ جاتے ہیں کہ پھر اسے خود سے جدا نہیں کر پاتا۔صنفی رشتہ ایک پر اسرار رشتہ ہے جو جانوروں اور پودوں کے ساتھ استوار کیا جاتا ہے۔نظریات، عقائد اور یقین کی بنیاد پر غیر انسانوں سے رشتہ قائم کرنا ڈیکولا کے نظریات کو تقویت دیتا ہے۔یہ عویدہ دیو مالائی اور اساطیری حکایتوں سے بھر پور ہے جو عقیدہ یا یقین کی بنیاد پر خاندانوں، نسلوں، قبیلوں اور گروہوں کی صورت میں متحد کرتا ہے۔جیسے پتھروں کی عبادت، سورج، چاند، درختوں، جانوروں

سے اس حد تک عقیدت سے پرستش کرنا کہ ان کی روح کو خود میں محسوس کرنا اور خارجی طور پر ہر تضاد و تفریق کو ممنوع قرار دے دینا ہی کلیت پسندی ہے۔ جس میں احساس مخفی ہے۔ یہ عقیدہ مخصوص قبیلوں میں آج بھی مروج ہے۔اس بنیادی نظریے کو ڈیکولا اس طرح بیان کرتا ہے کہ جہاں انسان دیگر غیر انسانوں (بالخصوص جانوروں، پودوں یا طبعی عناصر) کے ساتھ اپنی طبعی، روحانی اور اخلاقی خصوصیات کو ایسا تبادلہ (exchange) کرتا ہے جس سے وہ صنف کی حدود پار کر لیتا ہے۔ ڈسکولا ایک اور فلسفی و نقاد لاوی اسٹراس کے ایک مضمون " ٹوٹی۔ال۔لوزن "کا حوالہ دیتا ہے جو کہتا ہے کہ

"یہ آفاقی تقسیم سے بالا تر ہے۔ جو شناخت کے دیگر اصولوں میں بنیادی حیثیت کا حامل ہے۔اس کی بہترین مثال جنوب مغربی آسٹریلیا کے قبائل سے لی جاسکتی ہے۔"(۸)

کلیت پسندی(Totemism) داخلی و خارجی دونوں خصوصیات میں اشتراک کی حامل ہے۔ یہ عقیدہ انفرادی طور پر بھی مانا جاتا ہے اور اجتماعی طور پر بھی بہت سے انسان کسی ایک جانور، پودا، پہاڑ، پانی، ندی، پتھر کو اپنا کلیہ "ٹوٹم" تصور کرتے ہیں۔اور والہانہ عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے صنفی تفریق کو نظر انداز کرتے ہوئے صنفی تفریق کو نظر انداز کرتے ہوئے داخلی و خارجی سطح پر اشتراک کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ جنوب مغربی آسٹریلیا میں ننگر قبیلہ کلیت پسند ہے جو "مارنتج" کہلاتے ہیں۔ جو "سفید کوکاٹو "اور "کوا" کو اپنا کلیہ (ٹوٹم) تصور کرتے ہیں۔ یہ تمام پہلو انسانوں کو غیر انسانوں سے قریب ترین کر دیتے ہیں۔(۹) ان کلیوں (Totems) کی بہت سی اقسام ہیں جو اپنا انفرادی کلیہ رکھتے ہیں۔ان کی ظاہری صورت اور طرز عمل انضباطی ڈھانچے کا عکاس ہے۔ معاشرتی تضادات کے باوجود کلیت پسند اپنے کلیوں اور عقیدوں کے پابند رہتے ہیں۔ وہ تمام غیر انسانوں کو اور خود کو ایک روح مانتے ہیں۔

شناخت کا تیسرا اصول " مشابہت " (تشبیہات) ہے۔ جسے انگریزی اصطلاح میں " اینالاگ ازم " کہتے ہیں۔ جو ایک منطق اور دلیل وضع کرتی ہے۔ایک ایسی منطق جو تاثر کی وجہ سے بنتی ہے۔اس اصول میں یہ نظریہ پیش کیا جاتا ہے کہ تمام کائناتی وجود ذاتیں، ہستیاں، مادی شے، عناصر بے شمار خاصیتوں، سانچوں، ڈھانچوں اور وجود میں مختلف وقفوں کے ساتھ پارہ پارہ ہو جاتے ہیں۔ یہ درجہ بندی کے پیمانے میں ترتیب پاتے ہیں۔

"The third mode of identification, analogism, is predicated on the idea that all the entities in the world are fragmented into a multiplicity of essences, forms, and substances."(10)

مشابہت (Analogism) دنیا میں ایسے نیٹ ورک کی طرح پھیلا ہوا ہے جو تمام مادی وجودات کی داخلی خاصیتوں کو مربوط اور پیوست کرتا ہے۔ کائنات کا اہم سرمایہ معاشرہ، انسان، ماحول، ثقافت، ہے جو مشابہت (اینالاگ ازم) کی بدولت تشکیل پاتا ہے۔ فلپ ڈیکولا اس کی مثال قرون وسطی اور نشاۃ ثانیہ کے حوالے سے دیتا ہے۔ اس دور میں مرکزی کائناتی ماڈل ہر کام کیا گیا۔ کائناتی ماڈل (cosmological model) سے مراد ہے کہ کائنات کے موجودہ وجوہات کے اس پر اثرات اور وقت کے ساتھ ساتھ اس کائنات میں ہونے والی تبدیلیوں کے ارتقاء کو پیش کرتا ہے۔

مشابہت (Analogism) کا عمل اس دنیا کے بکھرے ہوئے آزاد عناصر کو یکجا کرتا ہے۔ اس طرح یہ مزید ناقابل تسخیر ہو جاتا ہے۔ جب عناصر پہلے سے ہی امتیاز و تفریق کا شکار ہوں تو مشابہات ہی اسے جوڑنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔

اگر مشابہت کی توانائیوں کو عناصر میں تلاش کیا جائے تو یہ خاص استحقاق کی بدولت ہی ممکن ہو گا۔ یہی اس کے عمل کا نچوڑ ہو گا۔ یہ دنیا کے عناصر کو اس کے تضادات کی بنا پر رد کر دیتا ہے۔ کائناتی عناصر میں پیدا ہونے والے انتشار، ناموزونیت، امتیازات اور ناموافقت جن سے یہ عناصر جدا ہو جاتے ہیں ان کو مضبوط کینوس پر بنیاد مشابہات کی بدولت ملتی ہے۔ جس سے وہ کسی گروہ میں جڑ جاتے ہیں۔ کائناتی وجود، مظاہر کا اس طرح مطالعہ کرتا ہے کہ عناصر کی داخلیت و خارجیت کو الگ کر دیتا ہے۔ یعنی اندر اور باہر دونوں لحاظ سے ہم میں کچھ مشترک نہیں۔ دنیا اختلافات عمل سے عبارت ہے۔ یہاں بے شمار مادی عناصر ایسے ہیں جو اپنی داخلی نوعیت، ڈاخلی فکر، خارجی صورت، خارجی وجودیت میں امتیازی صفات کے حامل ہوتے ہیں، لہذا مشابہات ان کے مشترکہ عناصر کو تلاش کر کے ان کو باہم مربوط اور پیوست کرے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ یہ تسلسل و غیر تسلسل میں ربط و ضبط پیدا کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔ ایک انسان بھی اپنے داخل اور خارج سے جدا ہوتا ہے، یہ اس کے داخل خارج میں وابستگی کا سبب بنتی ہے اور مشابہت کا کام امتیازات تلاش کر کے ان میں اشتراک کے پہلو تلاش کرنا ہے۔ اگر اشتراک کے پہلو برآمد نہ ہوں تو ان میں وابستگی کی گنجائش پیدا کرتی ہے۔ ماحول میں ہر طرف ایسے عناصر بکھرے ہوئے ہیں۔ یہ اصول چین، جنوبی افریقہ، انڈیس اور میسوامریکہ میں عام پایا جاتا ہے۔ جہاں مختلف قومیں اپنے نظریات و تصورات میں شکل و شباہت میں اختلاف رکھنے کے باوجود تسلسل و موافقت پر قائم ہے۔ شناخت کے چار اصولوں میں آخری اور سب سے اہم "فطرت پسندی" یا (Naturalism)) ہے۔ یہ اصول معمول کی زندگی گزارنے والے انسانوں میں پایا جاتا ہے۔ یہ نظریہ سترھوی صدی سے تنقید میں جگہ پائے ہوئے ہے۔ فطرت پسندی (Naturalism) صرف عناصر کے وجود کا نام نہیں

بلکہ یہ فنون لطیفہ، ثقافت، کلچر کا بھی داعی ہے۔ فطرت پسندی (Naturalism) کی اصطلاح کافی وسیع ہے۔ جس میں دیگر عناصر ضم ہو جاتے ہیں۔ انیسویں صدی میں فطرت پسنی کی حدود وضع کی گئیں۔ اب اگر فطرت پسندی کے تناظر میں بات کی جاتی ہے تو وہ یہ کہ فطرت ایک ہے جبکہ کلچرز بہت سے ہیں۔ اس فطرت میں ہی تمام ثقافتیں اپنی پسند، ناپسند، ضروریات واستعمالات کو بروئے کار لاتی ہیں۔ وہ بنتی ہیں، سنورتی ہیں اور بکھرتی جاتی ہیں۔ مگر فطرت اپنی جگہ قائم رہتی ہے۔ انسان کا ماحول سے رشتہ ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا۔

"انسان نہ تو ماحول کا غلام ہے اور نہ ہی حاکم وہ اپنے ماحول کے تمام عناصر سے تطابق اور ہم آہنگی کے رشتے سے جڑا ہے۔" (۱۱)

فطرت تمام مادی و غیر مادی، انسانی و غیر انسانی، موجودی و غیر موجودی عناصر کی تشخیص کرتی ہے۔ یہ داخل کو خارج سے الگ کرتی ہے۔ اور خارج کو الگ مقام دیتی ہے۔ فطرت و انسان کی داخلی و خارجیز ندگی میں تضاد ہے۔ اس طرح روح اور مادے کی وجہ سے فطرت پسندی علم موجودات (ontology) کے اصول صنفی تضاد (Animism) کو الٹ دیتا ہے۔ فطرت پسندی انسان کو غیر انسان سے جدا کرتی ہے۔ انسانوں کے گروہ اندر سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ سب انسان ایک سا نہیں سوچتے، سب کی پسند ایک سی نہیں ہوتی، ہر کوئی ایک سا لباس نہیں پہنتا۔ ہر کوئی ایک سی تہذیب نہیں رکھتا۔ لہذا یہ تمام دنیا فطرت پسندی (Naturalism) کے جال میں بنی ہوئی ہے۔ جو تصور، خیال، پسند، سوچ، طرز، احساس، عمل، جذبات، نظریات کے اعتبار سے مختلف ہے۔

فطرت پسندی داخلی تضاد کی پروردہ ہے جو داخلی تضاد کو قبول کرتی ہے۔ اور اسے امتیازی مقام دیتی ہے۔ یہ تضاد ہی مختلف ثقافتوں، کلچرز اور تہذیبوں کو جنم دیتا ہے۔ یہ تضاد صرف فطرتی عناصر اور انسانوں میں یا مادی و غیر مادی میں ہی نہیں ہے بلکہ انسانوں کے مابین بھی یہ تضاد ہے۔ جیسے تمام دنیا کے انسان ایک زبان نہیں بولتے، نہ ہی ایک زبان سمجھتے ہیں۔ ان تضادات کی مثالیں ہمارے ارد گرد بکھری ہوئی ہیں۔ فطرت پسندی ہر ایک کے ظاہری و باطنی تضاد کو ماننے پر مجبور کرتی ہے۔ فطرت پسندی روح، احساس اور باطنی صفات کو مسترد کر کے مادے کو اہمیت دیتی ہے۔ ڈسکولا اس حوالے سے ڈارون کے نظریۂ انسان پر بات کرتا ہے۔ کہ انسان اپنی طبعی حدود مواد میں ہی تلاش کرتا ہے۔ اس کے لئے مادہ نہایت اہم ہے۔ غیر انسانی مادے کو اپنی شناخت کے لئے داخلی محرکات کی ضرورت پڑتی ہے۔ ڈسکولا کہتا ہے کہ ہر مادے کا ظاہر و باطن لازمی ہے۔ فطرت پسندی مادے کی بحث کرتی ہے۔

"Naturalism inverts the ontological premises of animism since, instead of claiming an identity of soul and a

difference of bodies, it is predicated upon a discontinuity of interiorities and a material continuity."(12)

دنیا کے مکینوں نے اس دھرتی میں رہنے کے جو معیارات قائم کئے ہیں، وہ شناخت کی چار حقیقتوں کی بناء پر ہیں۔ شناخت کے یہ اصول دنیا میں رہنے والوں کی خصوصیات کا احاطہ کرتے ہیں۔ ان میں سے کوئی ایک بھی دوسرے پر غالب آجائے تو متنوع اصول سامنے آجاتے ہیں۔ فلپ ڈسکولا نے علم موجودات اور علم بشریات کا مطالعہ کرتے ہوئے فطرت یا نیچر کو انسان سے الگ نہیں کیا بلکہ یہ سب اکائی کی صورت میں کام کر رہے ہیں۔ ڈیکولا کے نزدیک شناخت کے ان چاروں ماخذوں میں سے ہر انسان شناخت کا کوئی اصول ضرور اپناتا ہے۔ یہ چاروں اصول انسان کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ اس کی فکر، نظریے یا خیال میں تبدیلی آنے سے یہ اصول بھی اس پر اثر انداز ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ان اصولوں سے دنیا میں بشری تقسیم سے آگاہی ملتی ہے۔ انسان نے اپنے رجحانات کے سبب کن ماحولیاتی ضابطوں کی اتباع کی ہے؟ دنیاوی خصوصیات انسان کو مطابقت اور عدم ضابطوں کی جانب دھکیلتی ہے؟ ڈیکولا کا نقطہ نظر تمام عالمی رجحانات و نظریات سے بالا تر ہے۔ انسان اپنے مخصوص ضابطوں اور جسمانی قوانین کے ساتھ پیوست ہے۔ وہ ان اصولوں کو اپنا کر ماحول کے ساتھ موافقت و عدم موافقت کا اظہار کرتا ہے۔ جو خصائص، تعلقات، انسانوں کے لئے مختص ہیں یہ ممکن نہیں کہ وہ ان سب تک رسائی پا سکیں۔

"According to circumstances, each human is capable of making any of the four inferences, but will most likely pass a judgment of identity according to the ontological context." (13)

ڈیکولا کے نزدیک یہ چار شناختیں حیرت انگیز حکمت کی حامل ہیں۔ بجائے اس کے سوسائٹی یا ثقافتوں کو تسلیم کیا جائے ان چار شناختوں سے دنیا کے رجحانات کو منظم نظام میں تشکیل کیا جا سکتا ہے۔ تمام انسانوں کی بنیادی خصوصیات ودیعت شدہ ہیں۔ مثبت خصوصیات اور ان سے جڑے تعلقات، علمی و فنی سطح پر انسانوں میں تقسیم کئے گئے ہیں۔ جیسے صنفی تضاد (Animism) ایمازون اور سائبیریا کے علاقوں میں پایا جاتا ہے۔ جہاں رہنے والے بیشتر قبائل انسانوں اور غیر انسانوں میں داخلی تسلسل کے قائل ہیں، بشرطیکہ صنفی و ظاہری حیثیت سے جدا ہوں۔ کلیت پسندی (Totemism) آسٹریلیا کے دیگر قبائل میں، ہندوستان کے کثیر مقامات پر اب بھی رائج ہے۔ جس میں کلیہ (Totem) کو کل مان لیا جاتا ہے۔ مشابہات (Analogism) کو قدیم چین کے ان لوگوں سے منسلک کیا

جاتا ہے جو مختلف صنفی، داخلی، خارجی، ظاہری تضادات ہونے کے باوجود ان میں مشابہت اور خاص استحقاق کی وجہ تلاش کر لیتے تھے۔اسی طرح میکسیکو بھی مشابہات(Analogism) کی اہم مثال ہے۔شناخت کا آخری اصول فطرت پسندی(Naturalism) ہے جو علمیات اور فلسفیات کا اہم جزو مانا جاتا ہے۔یہ فلسفہ جدید یورپی نظریات کا حامل ہے۔ڈیکولا کا یہ ماننا ہے کہ دنیائیں کثیر تعداد نہیں ہیں بلکہ انسان اسی دنیا میں مادی وسائل، علمی ذکاوتوں کے ساتھ مل جل کر رہتا ہے۔مادی و غیر مادی شے سے اس کے رشتے، خیالات، پسند، احساسات جڑے ہوئے ہیں۔جو اس کی ضرورت کے مطابق تقسیم ہوتے رہتے ہیں۔دنیا کو چلانے کا یہ نظام رشتوں کی تشخیص کرتا ہے۔ان سے وابستہ خصوصیات کو انسانی و غیر انسانی نظام کے تابع کرتا ہے۔ڈیکولا کے نزدیک دنیا کا علمی نظریہ اس سے جداگانہ تصورات کا قائل ہے۔اس کے لئے یہ ماورائی حقیقت سے زیادہ نہیں۔

دنیا کے ہر انسان کا اپنا مخصوص نقطہ ء نظر ہوتا ہے۔کسی ایک کی پسند دوسرے پر غالب نہیں آسکتی۔دنیا میں رہنے والے اپنی نظر سے دنیا کو دیکھتے ہیں۔انسانوں کی مختاری(Agency) مادی اور غیر مادی شے پر اپنا اثر ورسوخ رکھتی ہے۔دنیا کے مختلف املاک، ادارے، نظام انسانوں کی فطرت کے امین ہیں۔ثقافت اور فطرت کو یورپ الگ گردانتا ہے۔جبکہ ڈسکولا کے نزدیک فطرت اور ثقافت میں کوئی تضاد نہیں۔فطرت اور ثقافت انسان اپنے مزاج ،ماحول اور سوچ کے مطابق ڈھال لیتا ہے۔جس میں بعض اوقات انسان کے استفادے میں فطرت برباد بھی ہو جاتی ہے، جو ردعمل کے طور پر انسان کے لئے منفی سامان پیدا کرتی ہے۔دنیا میں ہونے والی ہمہ دم تبدیلیاں آفاقیت کے استحکام کو متاثر کرتی ہیں۔یہ تبدیلیاں ہمارے سماج، ماحول، فطرت، ثقافت، مزاج خیال، احساس میں امتیاز پیدا کرتی ہیں۔سب ایک سا نہیں سوچتے۔اختلافات، امتیازات کا سمندر تمام انسانوں کے درمیان حائل ہوتا ہے۔جس سے شناخت کے اصول اور رابطوں کے اصول آفاقی و عالمگیری سطح پر پیچ و خم کھاتے ہیں۔

شناخت کے ان اصولوں کے سبب ہی انسانوں کی غیر انسانوں سے موافقت، ناموافقت، موزونیت، غیر موزونیت آشکار ہوتی ہے۔انسان ان میں مبتلا ہو کر اپنی شناخت ان ضابطوں میں ڈھال لیتا ہے۔جس سے اس کی منفرد حیثیت متعین ہو جاتی ہے۔دنیا کے متنوع غیر مادی و مادی اشیاء سے انسانوں کی وابستگی فطری ہے جو ماحول کی مرہونِ منت ہے۔

> "The word environment describes living and nonliving surroundings relevant to organisms. It incorporates physical, chemical and biological factors and processes

that determine the growth and survival of organisms, populations, and communities." (14)

یورپی و مغربی نظریات کے بموجب اگر یہ مان لیا جائے کہ فطرت اور ثقافت دو الگ چیزیں ہیں تو ہمیں اس امر پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ انسان ان سے الگ ہو کر زندہ رہ سکتا ہے؟ کیا اس کا وجود ان کا محتاج نہیں ہے؟ ان سوالات کے جوابات کے لئے ڈسکولا کی تھیوری "فطرت اور ثقافت سے آگے" (Beyond nature and culture) کا مطالعہ کرنا ضروری ہے۔ وہ شناخت اور رابطے کے اصول پیش کرتا ہے۔ جن کا بالا سطور میں ذکر کیا جا چکا ہے۔ تاریخ میں ایسی بہت سی تہذیبیں گزری ہیں جو اپنی انفرادیت کے آج تک آثار قدیمہ میں شمار ہوتی ہیں۔ وادی نیل کی تہذیب، وادی دجلہ و فرات کی ثقافت، وادی سندھ کا تمدن شامل ہے۔ میسوپوٹامیہ کی ثقافت میں سیمری قوم، قدیم اہل بابل، آشوریوں، کلدانیوں کی شراکت رہی۔ جس نے اس تہذیب کو ثقافتی ورثے میں تبدیل ہونے میں مدد کی۔

علم بشریات تمام قدیم و جدید تہذیبوں اور ثقافتوں کا بلا امتیاز مطالعہ کرتا ہے۔ ان تہذیبوں میں کسی کو بھی اعلیٰ وارفع یا ناقص قرار نہیں دیتا بلکہ سب کا تقابل و موازنہ مساوی بنیادوں پر کیا جاتا ہے۔ ثقافت نے اسی لمحے جنم لیا جب سے انسان نے اس کرہ ارض پر قدم رکھا۔ ثقافت کی بدولت نسلوں کے تجربات، مشاہدات، عقائد و نظریات کا ذخیرہ اکٹھا ہوا اور یہی سرمایہ دور حاضر میں بھی اگلی نسلوں تک منتقل ہو رہا ہے۔

دنیا کے تمام اسالیب ادب نے اس پر قلم اٹھایا ہے۔ ثقافت کا ذکر شاعری و نثر دونوں میں نظر آتا ہے۔ شاعری اپنے دور کی عکاس ہوتی ہے۔ اس دور کی زبان بول چال، لہجہ، انداز و اطوار سب ثقافت کی پہچان کہلاتے ہیں۔ نثری اصناف افسانہ، ناول، ڈرامہ، سفر نامہ، یادداشتیں، سوانح عمریاں، آپ بیتیاں سبھی ثقافت کا بالواسطہ یا بلاواسطہ پرچار کر رہی ہوتی ہیں۔ اردو ادب دنیا کا ایسا ادب ہے جس نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے۔ اس ادب نے یونانی، مغربی، فرانسیسی ادب سے خوشہ چینی کی ہے، مگر ایک خوبی ایسی ہے جو اسے اردو ادب بناتی ہے وہ اس میں بسی ہوئی "ثقافت" ہے۔ ہندوستانی معاشرہ اور سماج یہاں کے ادب میں نمایاں نظر آتا ہے۔

> "ہندوستانی سماج میں انیسویں صدی سے جو تبدیلیاں شروع ہوئی تھیں، انہوں نے بیسویں صدی کے آغاز تک ہندوستان کی عمومی صورتحال میں چند عناصر کو ایسی جگہ عطا کر دی تھی کہ ان کی بنا پر یہاں سماج ایک نئی شکل اختیار کر رہا تھا۔ ان عناصر کا اثر ہماری زندگی کے ہر پہلو پر پڑنا لازم تھا۔ چنانچہ اردو زبان و ادب بھی نہ صرف ان سے متاثر ہوئے بلکہ ان کا کردار بھی بڑی تیزی کے ساتھ بدلنے لگا۔"(۱۵)

اردو ادب کا ایک نامور ناول ارشد چہال کا "دھندلے کوس" نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ ارشد نے جنس نگاری کا راستہ چھوڑ کر اپنے لئے انسانی ثقافت کا راستہ تلاش کیا ہے۔ اور روزمرہ زندگی سے تعلق رکھنے والے کرداروں کے انسانی وجود کو نئے سرے سے تخلیق کیا ہے۔(۱۶)

دھندلے کوس کا بنیادی موضوع "ثقافت" ہے۔ ارشد چہال نے اس ناول میں شہری، دیہی اور صحرائی زندگی کے نمونے پیش کئے ہیں۔ زندگی کے بہت سے رنگ اس ناول میں بکھرے نظر آتے ہیں۔ اس ناول کے کردار، مکالمے، مناظر، احساسات، ہندوستانی ثقافت کے امین ہیں۔ انسانی تہذیب، ثقافت، فطرت، ماحول، تعلقات، سماج، معاشرہ، فکری و فنی سطح پر اجاگر کیا گیا ہے۔ ثقافت کے بعد اس ناول کا دوسرا اہم موضوع "طبقاتی کشمکش" ہے۔ ہمارا سماج دو طبقوں میں منقسم ہے۔ ایک امارت کی علامت ہے اور دوسرا مفلسی کی۔ کوئی شہری ہے تو کوئی دیہاتی۔ سماج کی یہ تفریق نہ ماضی میں ختم ہو سکی اور ممکن ہے کہ مستقبل میں بھی ختم نہ ہو سکے۔ جس کی اہم وجہ "ثقافت" ہے۔ ثقافت وہ زیور ہے جو مفلس کو امیری کے قریب نہیں جانے دیتا۔ بلکہ اپنی زنجیروں میں جکڑ کر اسے اپنے ماحول اور معاشرے کے خمیر میں پیوست کر کے رکھتا ہے۔ تو دوسری طرف دولتمند طبقہ اپنی شان و شوکت، جلال و حشمت، دولت ثروت کا ایسا اسیر ہو جاتا ہے کہ اپنے ثقافتی دائرے سے باہر نہیں آ سکتا۔ گویا معاشرے میں طبقاتی کشمکش کے باوجود جو شے انسان کو انسان سے مضبوط کیے ہوئے ہے یا ان میں تفریق پیدا کیے ہوئے ہے، ثقافت ہے۔ دھندلے کوس میں بھی یہ تفریق بہت سے مقامات پر نظر آتی ہے۔ جس سے قاری ایک کرب میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ مگر ثقافتی اقدار کو دیکھتے ہی تنقید نہیں کر سکتا۔ کیونکہ دولت مند ہو یا مفلس، اپنے اپنے کلچر سے جڑا ہوا ہے۔ اس میں یکسانیت یا تفریق لازم و ملزوم ہے۔

> "یگانگت اور اختلاف منطقی طور پر ایک دوسرے کے متناقص ہیں۔۔۔ایک دوسرے میں مفاہمت، یگانگت کا انحصار باہمی اختلاط کی جامعیت پر قائم ہوتا ہے۔ جس میں اختلاف ہونا ناگزیر ہے۔ ورنہ ایک دوسرے کی ضرورت نہ ہو۔ گویا یہ دیکھنا ہو گا کہ ہر فرد معاشرے میں اپنا کیا کردار ادا کرتا ہے۔"(۱۷)

دھندلے کوس راجگی اور صحرائی زندگی کی درمیانی کڑی ہے۔ اس ناول کا مرکزی کردار شہباز خان ہے۔ جس کا اولین شوق شکار کرنا ہے۔ راجگی ایک حویلی ہے جو ثقافتی عناصر کا مجموعہ ہے۔ چوبیس کھڑکیوں پر مشتمل راجگی میں ہر سہولت دستیاب ہے۔ باورچی خانے میں ہر وقت نئے کھانے پکنے کی خوشبو پھیلی رہتی، شکار خوردہ جانوروں کا بھنا ہوا گوشت ہر دستر خوان کی زینت ہوتا۔ وسیع صحن، دالان اور کشادہ آرام گاہوں سے راجگی کا سکون طبیعت پر شگفتگی کے رنگ گھولتا ہے۔ بابا عبدل باورچی خانے کا منتظم ہے۔

"بابا عبدل نے جب سے ہوش سنبھالا تھا، اس کی زندگی، زیادہ تر وقت خانزادوں کے لیے گوشت بھونتے ہوئے اسی باورچی خانے میں ہی گزرا تھا اور اسے معلوم بھی نہیں ہوا تھا کہ گوشت سینکتے سینکتے وہ کب بوڑھا ہو گیا تھا۔"(۱۸)

ارشد چہال کرداروں کے تعارف کے ساتھ ساتھ ثقافتی عناصر اور ثقافتی تغیرات کو ذکر بھی کرتے جاتے ہیں۔ راجگی میں مختلف جانوروں کا شکار کر کے گوشت کھانا معمول تھا۔ جب کبھی شکار خوردہ گوشت دستر خوان پر نہ ہوتا تو شہباز خان کو ہی متوجہ کیا جاتا کہ وہ شکار کر کے لائے۔

کسی بھی معاشرے کی ثقافت، تہذیب، روزمرہ زندگی میں سرانجام پانے والا ہر کام سوچ، نظریہ کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ یہ احساسات ہمارے ماحول کے عطا کردہ ہوتے ہیں، جو ثقافت کی عکاسی کرتے ہیں۔ ناول میں راجگی کا جو نقشہ پیش کیا گیا ہے وہ وہاں کے رہن سہن، طرز حیات، انداز و خطاب، افکار و نظریات کو عیاں کرتا ہے۔ راجگی کی سجاوٹ، مناظر اور چیزوں کا تناسب ان کے خاص مزاج، ثقافتی رومانیت کی نشاندہی کرتا ہے۔

"خان ہال کی دونوں بڑی دیواروں پر کالے پرنوں کے حنوط شدہ سر ٹنگے ہوئے تھے، جن کے نیچے سنگ مر مر کی خوبصورت محرابیں بنی ہوئی تھیں۔ ہال کے ایک کونے میں سلیٹی رنگ کے صوفے بچھے ہوئے تھے۔ عین وسط میں ہلکے سبز قالینوں پر شیر اور چیتل کی کھالیں بچھی ہوئی تھیں۔ سامنے والی دیوار پر سیڑھیوں کے ساتھ ساتھ طرح طرح کے جنگی ہتھیار لٹکے ہوئے تھے۔ ایک کارنس پر حنوط شدہ مرغابیاں اور سرخاب رکھے ہوئے تھے۔ کسی زمانے میں اس گھر کے مکینوں کو جنگ و جدل اور شکار کا بڑا شوق ہوا کرتا تھا۔"(۱۹)

ثقافت ایسا مرکز ہے جس کی جانب انسان خود بخود کھنچا چلا جاتا ہے۔ اس کی کشش ہر ایک کو جکڑ لیتی ہے۔ انسان ثقافتی روایت کا امین بھی ہے۔ اور ثقافتی رومانیت کا پاسدار بھی ہے، وہ ثقافت کی دل و جان سے قدر بھی کرتا ہے اور اس کے اصول و ضوابط سے اکتا کر آزادی کا طلب گار بھی ہے۔ ثقافتی رومانیت لامحدود معنی کی حامل ہے۔ ایک جانب ثقافت سے رغبت، انسیت اور الفت اسے ثقافت کا اسیر بناتی ہے تو دوسری جانب ثقافت کی ہی رومانیت اسے ثقافتی تغیرات پر آمادہ کرتی ہے۔

انسان ثقافت کے دم سے ہی پہچان اور شناخت رکھتا ہے۔ اس سے جدا ہو کر اس کا وجود اقبال کے مطابق اس موج سا ہے جو سمندر سے نکل کر اپنا وجود کھو دیتی ہے۔ ثقافتی رومانیت ثقافتی عناصر سے پیار کرنا بھی سکھاتی ہے۔ اور کبھی ان سے بغاوت پر بھی اکساتی ہے۔ بغاوت کر کے بھی انسان کسی نہ کسی ثقافت کا فرد رہتا ہے۔ دھندلے کوس

ثقافتی تغیرات اور ثقافتی رومانیت کا امین ہے، جہاں بہت سی ثقافتیں مل کر انسان کے رہن سہن کے نئے نئے ڈھنگ اجاگر کرتی ہیں۔ ناول نگار کے تخیل کی وسعت، زندگی کا مطالعہ، تجزیہ اور گہرا مشاہدہ بھی ضروری ہے ارشد میں یہ سب صلاحتیں موجود ہیں۔(۲۰)

ارشد چہال نے ناول دھندلے کوس میں ثقافت، فطرت، رومانی ماحولیات کا بکثرت استعمال کیا ہے جس کا سبب یہ ہے کہ ارشد نے اپنا بچپن دریائے جہلم کے قریب گاؤں میں گزارا، جہاں انہوں نے فطرت کو بہت قریب سے دیکھا۔ اس لئے ثقافت اور ماحولیات ساتھ ساتھ چلتے دکھائی دیتے ہیں۔ ناول میں بہت سی ثقافتیں ایک دوسرے کے ہمراہ چل رہی ہیں۔ جبکہ ملک ایک ہی ہے۔ اور تمام لوگ بحیثیت مجموعی ایک قوم ہیں۔ مگر رہن سہن، طرز حیات، ایک دوسرے سے تفرق رکھتا ہے۔ ثقافتوں کا یہی امتیاز ارشد چہال کے پیش نظر ہے، جو وہ قاری کو دکھانا چاہتے ہیں۔

ثقافت ہر دور میں تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ ایک ہی سرزمین کے باسی مختلف طرز حیات گزارنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ اگر تاریخی ثقافتوں پر نگاہ دوڑائی جائے تو قریبا ایک صدی بیشتر کے تمام انسان ایک سی زندگی گزار رہے تھے۔ بیسویں صدی میں جب نئی ٹیکنالوجی کا دور شروع ہوا تو انسان جو قدیم روایات، عادات واطوار کا حامل تھا، جدید مصنوعات کو بخوشی اپنانے لگا، اس طرح اس کی ثقافت میں یہ تمام نئے ثقافتی عناصر بھی داخل ہو گئے۔ اکیسویں صدی میں جیسے جیسے دور گزر رہا ہے، جدید ثقافتی عناصر اختیار کر لینے سے تمام انسانوں کی ثقافت میں یکسانیت آ رہی ہے۔ فرق صرف انہی میں نظر آتا ہے جو ان جدید ثقافتی عناصر کو اپنی غربت یا مجبوری کے سبب اپنانے سے قاصر ہیں۔ دھندلے کوس بھی ایسے ہی طرز زندگی کے متنوع صورتوں کا عکاس ہے۔ راجگی میں رہنے والے اپنے مخصوص طرز حیات کے ترجمان ہیں۔ جو ان آسائشوں کو اپنی زندگی میں اس حد تک دخیل کر چکے ہیں کہ اس دائرے سے باہر انہیں کسی کا دکھ، درد، تکلیف محسوس نہیں ہوتی۔ دوسری جانب دریاؤں کے کنارے رہنے والے لوگ جدید ثقافتی عناصر سے لیس تو نہیں مگر وہ بھی اپنا مخصوص کلچر رکھتے ہیں۔ دیہاتوں میں رہنے والے اپنی ثقافت کے اس قدر اسیر ہو چکے ہیں کہ شہروں میں رہنا ان کے لئے کسی اذیت سے کم نہیں ہوتا۔ صحراؤں میں رہنے والے تپتے صحرا کی گرمی، پیاس اور میلوں کوس پیدل چلنے کے اس قدر عادی ہو چکے ہیں کہ صحرا میں آنے والی گاڑیاں ان کے لئے حیرت سے کم نہیں ہوتیں۔ صحرا میں بسنے والے ایک دوسرے کو ہی اپنا سہارا سمجھتے ہیں ان سے جدا ہو جانے کا تصور بھی نہیں کرتے۔ ثقافتوں کی بے شمار اصناف اور متنوع شکلیں ہمیں اس ناول میں دکھائی دیتی ہیں۔

"راجگی کا کوئی فرد تو حکومت میں ہونا چاہیے۔ کیا ہم پیشہ اپنے بزرگوں کے کارناموں پر ہی جشن مناتے

رہیں گے۔ کوئی جشن تو راجگی میں ہمارے اپنے کسی کارنامے پر بھی منایا جانا چاہیے، تاکہ ہمارے بزرگوں کی روحوں کو سکون ملے۔۔۔سب سے بڑھ کر راجگی کا نام روشن ہو گا۔"(۲۱)

یہاں راجگی کی رومانی ثقافت حاوی نظر آتی ہے۔ راجگی کا ماحول اقتدار حاصل کرنے، جاہ و حشمت وصول کرنے کا ہے۔ وہ ترقی یافتہ ثقافت کے قائل ہیں۔ ہر شے خود ان کی غلامی کرتی دکھائی دیتی ہے۔ وہ اسی طرز حیات کو مستحکم کرنے کی تگ و دو میں لگے ہیں، جہاں ان کا انداز زندگی گزشتہ آباؤ اجداد کی ثقافت کو آگے بڑھنے کی جانب گامزن ہے۔

ثقافتی ماحول کو استحکام دینے والا اصل ہتھیار "سیاست" ہے۔ جس سے ان کی نسلوں کو عروج و دوام حاصل ہو گا۔ ارشد چہال نے راجگی میں صنعتی دور کی ثقافت کو پیش کیا ہے۔ صنعتی انقلاب میں طاقت ور طبقہ اپنی ثقافت کے ملیامیٹ ہو جانے سے خائف ہے کہ کہیں ان کی اجارہ داری عام لوگوں کے برابر آ کر ختم نہ ہو جائے۔ راجگی کا ماحول اپنی ثقافت کو مضبوط و توانا بنانے کے لئے آگے سے آگے بڑھنے کا خواہاں ہے۔

دھندلے کوس میں پنجاب کی بہت سی ثقافتوں کو عیاں کیا گیا ہے۔ کہیں راجگی کا ماحول ہے تو کہیں آرٹس کالج کے ثقافتی اور رومانی عناصر نظر آتے ہیں۔

"نیشنل کالج آف آرٹس کے لان میں درختوں کے سائے تلے ہر طرف ایزل لگے ہوئے تھے۔ اور لڑکے لڑکیاں ہاتھوں میں رنگوں کی طشتریاں اور برش اٹھائے پورٹریٹ بنانے کی مشق کر رہے تھے۔ ایک ایک ماڈل کے گرد تین تین چار چار سٹوڈنٹ کھڑے رہے جو مختلف پہلوؤں سے اس کے خدوخال کینوس پر اتار رہے تھے۔"(۲۲)

ناول میں جابجا ثقافتی و رومانی عناصر مصنف کی ثقافت پر گرفت کو عیاں کرتے ہیں۔ جب راجگی کا ذکر آتا ہے تو مرغابیاں، نرم بستر، قالینوں پر شیر کی تصاویر، دیواروں پر جانوروں کی کھالوں سے زیبائش، شکار کو گوشت، ستون، صدر دروازہ، وسیع لان، جنگلی بکروں، کے گوشت کی خوشبو، محفلوں کی رونق، سیاسی جلسوں کا اجتماع، دلفریب پھولوں کا کھلنا، جیسے ثقافتی رومانی عناصر نمایاں دکھائی دیتے ہیں۔

راجگی کا پُر تعیش ماحول قاری کے قلب و ذہن پر ایسا نقش مرتب کرتا ہے جس سے وہ راجگی کے طرز حیات، رہن سہن، رسوم رواج، عادات و اطوار سے بغیر دیکھے ہی آگاہی حاصل کر لیتا ہے۔ ہمارے ملک کی ثقافت نے ہم پر ایسا اثر منکشف کیا ہے کہ جاہ و حشمت سے بھرپور گھر، حویلیاں ہمارے قلب و ذہن کو غلام بنا لیتی ہیں۔ ہم ایک رینگتے کیڑے کی مانند ان کی جانب کھنچتے چلے جاتے ہیں۔ اپنی ثقافت کو روند کر پرائی ثقافت اپنانے کی سعی میں مصروف

عمل ہو جاتے ہیں۔ مگر ثقافتوں کا مسئلہ کسی بھی باسی کو پرانی دنیا میں بآسانی جینے نہیں دیتا۔ راجگی کے ماحول میں ہر شے، انسان، جانور، پودا، علم موجودات cosmology کی ہر شے بلکہ غیر موجودات بھی اسی تہذیب کے پروردہ دکھائی دیتے ہیں۔ سرفراز خان اور دلنواز خان جو مرکزی کردار شہباز خان کے بڑے بھائی ہیں، اپنے کردار میں بھی مخصوص ثقافتی رنگ لیے ہوئے ہیں۔

"سرفراز نے پٹوں کو کنگھی سے جماتے ہوئے کہا! بابا اور تو کوئی لڑکا پگڑی پہنتا نہیں۔ آفاق نے منہ بنا کر کہا اور کوئی پہن بھی کیسے سکتا ہے۔ تم تو راجگی کے جانشین ہو۔ اس لئے تمہارا پگڑی پہننا ضروری ہے۔ سرفراز نے مونچھوں کو بل دے کر اس کی طرف دیکھا۔۔۔ ادھر دلنواز خان اپنے تھری پیس سوٹ میں تیار ایک صوفے پر بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے اور ساحرہ اپنی تیاریوں میں مصروف تھی۔"(۲۳)

راجگی میں سب کے یہ ٹھاٹھ باٹھ پُر تعیش انداز ان کی ثقافتی پیش کش کرنے میں معاون ہے۔ پگڑی خاص جاگیر دارانہ طبقے کی عکاس ہے۔ اسے پہننے والے مقتدر لوگ سمجھے جاتے ہیں۔ پگڑی رومانی ثقافت کا اہم عنصر ہے۔ مونچھوں کو بل دینا، لباس اور رکھ رکھاؤ میں تکلفانہ انداز راجگی کی رومانی ثقافت کا غماز ہے۔ راجگی میں خواتین کا بننا سنورنا، چال ڈھال، انداز تخاطب، رہن سہن بھی ان کی رومانی ثقافت کی عکاسی کرتا ہے۔

زہرا بیگم (بیگم سرفراز) جب بھی تقریب کے لئے تیار ہوتیں۔ ساڑھی، زیورات، موتیوں کا استعمال لازم ہوتا۔ اسی طرح ساحرہ (جن کی اپنے دیور سے خاصی خوش مذاقی تھی) خوش لباس خاتون تھیں۔ دلنواز خان کو بھی اپنی بیوی سے محبت تھی۔ ساحرہ کے کمرے میں ہمہ وقت سحر انگیز پرفیومز کی خوشبوؤں کا بسیرا ہوتا۔ تقریب میں شرکت کرتے وقت مکیش یا سلک کے لباس زیب تن کرنا، بھنوں کو سکیڑنا، دوپٹے کا سر سرانا، راجگی کی رومانی ثقافت کی پاسداری کرتا ہے۔ ثقافت کے ساتھ انسان کا رشتہ اسی وقت شروع ہو جاتا ہے جب اس کا وجود اس کائنات پر پڑتا ہے۔ ثقافت روایت کا دوسرا نام ہے، اس سے انحراف بغاوت ہے۔ بغاوت رومانیت کا دوسرا نام ہے۔ فطری عناصر سے لگاؤ بھی رومانی ماحولیات کا حصہ ہے۔ وہ اس ماحول میں رہ کر اس کے اصول وضوابط کا پابند ہو جاتا ہے۔

"قدیمی انسان کا ماحول قریب قریب مستقل تھا۔ وہاں ذہن و فراست کی بجائے شجاعت اور کیریکٹر کی ضرورت ہوتی تھی۔ ازمنہ قدیم اپنے فرزندوں کو مرد بنانا چاہتا تھا، عالم نہیں۔"(۲۴)

ہماری موجود ثقافت بھی عورت کے بجائے مرد کی ہم کلام ہے۔ راجگی کے بعد آرٹس کالج کی ثقافت سامنے آتی ہے، جس کے رومانی ثقافتی عناصر میں درخت، ایزل، پورٹریٹ، برگد کے گھنے سائے، مختلف رنگ، برش، سریالزم کینوس کا بار بار ذکر کیا گیا ہے۔ یہ تمام مل کر کالج کا ماحول بناتے ہیں۔ عناصر موجودات کے ساتھ ساتھ غیر

موجودی عناصر بھی کالج کا حصہ ہیں۔ فرجام، عروبہ اور نائلہ وہ کردار ہیں جو آرٹس کالج میں بھی دوست ہیں اور ثقافتی اعتبار سے بھی فنون لطیفہ کے نہایت قریب ہیں، ان کا انداز شہری زندگی کا عکاس ہے۔ جیسے

"شام سے ذرا پہلے فرجام نے شیو بنائی اور نئے کپڑے پہن کر ہاسٹل سے باہر آ گیا۔۔اور مغربی مصوروں کی کتابیں دیکھنے لگا۔اس کے بعد وہ انگریزی ناولوں کے شعبے میں آ گیا۔"(۲۵)

فرجام فنون لطیفہ کے طالب علم ہونے کے ساتھ ساتھ شہری زندگی گزارنے کا سلیقہ بھی رکھتا ہے۔ تو دوسری جانب اس کے والدین چونکہ دیہات میں رہتے ہیں، وہ دیہاتی ثقافت کے رنگ میں ڈھل ہوا بھی دکھائی دیتا ہے۔ ثقافتی عناصر شہری اور دیہاتی اجزاء جدا ہوتے ہوئے بھی انسان کی زندگی پر بلاواسطہ اور بالواسطہ اثرانداز ہوتے ہیں۔ فرجام اور عروبہ کا گاؤں ایک ہی ہے۔اس گاؤں کی ثقافت اور تاریخ رومانی عناصر لئے ہوئے ہے۔

"چک شیراں چناب کے کنارے بسنے والے دیہاتوں میں ایک پرانا گاؤں تھا۔ جسے ایک بزرگ بابا علی شیر نے کسی زمانے میں آباد کیا تھا۔۔۔اس علاقے میں چندر جل پینے والوں کا ایک گڑھ تھا۔۔۔البتہ ہندوؤں کا ایک بڑا قلعہ چک شیراں سے ذرا فاصلے پر اب بھی موجود تھا جو کھنڈرات میں بدل چکا تھا اور اب اس میں سوائے پتھر کی فصیلوں اور ایک آدھ برجی کے کچھ باقی نہیں بچا تھا۔"(۲۶)

ارشد چہال نے گاؤں کی ثقافت کو محاکاتی انداز سے پیش کیا ہے۔ گاؤں کے مکان پکی اینٹوں سے تعمیر شدہ تھے، کچے مکانات بھی تھے۔ وہاں کی آب و ہوا میں بھی شدت تھی۔ جس طرح گاؤں کی زندگی میں لوگ محنت مشقت کرنے کے عادی ہوتے ہیں، چارپائیوں پر آرام کرنا، گھروں میں مویشی پالنا، کھیتوں میں ہل چلانا ان کے ثقافتی ماحولیات کا حصہ ہے۔

صحرائی ثقافت بھی معمول کی زندگی و ثقافت سے مختلف ہے۔ گرم جھلسا دینے والی ہوا، اڑتی ہوئی ریت، نخلستان کا گمان ہونے پر بھی پیاس کی شدت، خوراک کی عدم دستیابی، جنگلی پرندوں، جانوروں کا بسیرا، حشرات الارض کا ریگستان کی ریت ہر رینگنا، صحرا کی کل کائنات ہے۔

"اس ناول کی کہانی مختلف جہتوں پر مشتمل ہے۔ جس کے کردار پاکستان کے دریاؤں کے کنارے اور صحراؤں کے جھلسا دینے والے موسموں میں رہنے والے مختلف طبقوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ جہاں ایک لامتناہی تصور ملکیت ہر چیز کو سمیٹ کر اپنی جیبوں میں بھر لینے کی خواہش میں مبتلا ہے۔اور دوسری طرف زندگی پانی کی بوند بوند کو ترس رہی ہے۔اور پانی کی یہ کہانی دریاؤں اور صحراؤں کے فرق کو تخلیقی سطح پر اجاگر کرتی ہوئی انسانی زندگی کے لازوال جذبوں کی بہت عمدہ تصویر کشی کرتی ہے۔"(۲۷)

ناول کا مرکزی کردار شہباز جو شہری ثقافت کا پرستار ہے، جاگیر دارانہ طبقے سے تعلق رکھتے ہوئے راجگی میں

پُر تعیش زندگی گزار رہا ہے۔ شکار خوری predation کے شوق نے اسے صحرا کی جانب مائی کر دیا۔ ناول کا نسوانی مرکزی کردار "سانولی" ہے جو ایک صحرائی لڑکی ہے۔ جس کا میلا جسم، بے رنگ لباس، موٹے ہونٹ، حیران آنکھیں، ستاروں جیسے چمکتے دانت، سیاہ رنگت نے شہباز کو ایسی کشمکش میں مبتلا کر دیا تھا کہ شہباز نے شکار کی غرض سے صحرا کا رخ کیا اور اسے تلاش کرتے کرتے اس کے گھر تک پہنچ گیا۔ وہ سانولی سے شادی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مگر بحیثیت انسان اسے اس سے ہمدردی تھی۔

شہباز کی آرام گاہ میں سانولی کی تصویر کا آویزاں ہونا دراصل اسے اس مقصد کی یاد دلاتا، جس کا عہد اس نے کیا تھا کہ وہ صحرا کے لوگوں کی حالت زار ایئر کنڈیشن میں بیٹھے لوگوں اور اقتدار سنبھالے منصفوں تک ضرور پہنچائے گا۔

اس ضمن میں سانولی، اس کا خاندان، اس کا ماحول، اور اس سے جڑے احساسات کو شہباز دنیا کے سامنے لانا چاہتا ہے۔ کہ کس طرح انسان ناگفتہ بہ ماحول میں بھی جینے پر مجبور ہے۔ وہ ماحول جس میں کوئی عام انسان رہنے کو تیار نہیں، یہ لوگ اپنی تہذیب اور ثقافت کے امین ہیں۔ یہ کرلے اور چھپکلیاں کھانے پر تو تیار ہیں مگر اپنی ثقافت اور ماحول چھوڑنے کو تیار نہیں۔ اسی کا نام رومانی ثقافتی ماحولیات ہے۔

تصویر کا دوسرا رخ یہ بھی ہے کہ اگر یہ صحرائی لوگ عام انسانوں کے ماحول میں بس جائیں، ان کی ثقافت اختیار کر لیں، تو کیا شہری لوگ انہیں قبول کر لیں گے؟ کیا انہیں اپنے دستر خوان میں شامل کریں گے، ایسے لوگ شہری کلچر میں نہیں ملیں گے۔ بلکہ شہری لوگ انہیں دھتکاریں گے، نیچا دکھائیں گے۔ عزت کے بجائے ذلت سے ان کا استقبال کریں گے۔ حتیٰ کہ انہیں واشگاف جواب دے دیں گے کہ تمہاری جگہ وہی صحرا ہے۔

شہباز خان ان عام لوگوں جیسا نہیں، وہ صحرا کے درد کو سمجھتا ہے۔ صحرا کی پیاس کو محسوس کرتا ہے۔ ان کی ثقافت کو نفرت کے بجائے ہمدردی سے دیکھتا ہے۔ ان کی ثقافت کی پذیرائی کے لئے دستاویزی فلم بھی بناتا ہے۔ جس میں صحرا میں ہونے والی شادی میں تمام ثقافتی عناصر کو فلم کا حصہ بناتا ہے۔

ناول میں استعمال ہونے والے صحرائی ثقافتی عناصر میں صحرا کے مچھر، سانبھر، کوس، میلوں مسافت، کنواں، چمڑے کے مشک، گیدڑ، بلے، صحرائی کرلے بطور خوراک استعمال کرنا، بڑھی ہوئی داڑھی، میلا لباس، اونٹ، قبیلے کی عورتیں، کھجوروں کے پتوں سے بنی چارپائی، میلے لباس میں رنگوں کی شناخت نہ ہو پانا، چھپر میں بیٹھ کر کھانا، صحرائی زندگی کی وہ حقیقتیں ہیں جن کو عام شخص کبھی قبول نہ کرے۔

"سانولی۔۔۔ شاخوں سے بنے ہوئے چھپر کے نیچے بیٹھ کر روٹی کھانے لگی۔ آج پہلی مرتبہ کروں کا سرخ

سرخ قرمزی رنگ کا گوشت دیکھ کر اس کا دل متلایا تھا۔ حالانکہ بچپن سے وہ یہ ساری چیزیں بڑے شوق سے کھاتی آئی تھی۔ لیکن آج اسے مرے ہوئے کرلے اور پھران کا گوشت دیکھ کر یوں محسوس ہوا تھا جیسے یہ کوئی بہت ہی غلیظ چیز ہے، جو کھانے کے لائق نہیں ہے اور نہ ہی اسے کبھی کھانا چاہیے۔۔اسے راجگی میں کھائے ہوئے کھانے یاد آرہے تھے۔"(۲۸)

ناول میں جہاں صحرا کا ذکر کیا ہے، مصنف ہمیں اسی ماحول میں لے جاتے ہیں کہ جیسے ہم خود صحرا میں موجود ہیں اور وہاں کے ماحول کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ صحرا میں رہنے والوں کے نام بھی اپنی ثقافت کے لحاظ سے صحرائی ہے۔ جیسے سانولی، کوریا، بیکو، بھاتو، اور قبیلے کا نام بھی گیدڑی قبیلہ تھا۔

ارشد چہال نے جس ثقافت کو بھی پیش کیا قاری اس کے سحر سے نکل نہیں سکتا۔ ثقافتوں کا یہ نظام ہر عہد میں تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ ثقافت لازم و ملزوم یا جامد نہیں ہوتی بلکہ ہر نئے نصر کو، جدید فکر کو خود میں ضم کرتی رہتی ہے۔اس ناول میں ثقافتی رومانی عناصر صرف علم موجودات سے ہی بحث نہیں کرتے بلکہ بہت سے عناصر غیر طبعی اور مابعد الطبیعاتی انداز کے حامل بھی ہیں۔ جس میں زبان، خیال، سوچ، طرز ادا، طرز بیان، لب ولہجہ سر فہرست ہیں۔

ناول میں شہباز خان نے سانولی کو بیٹھنے کے لیے بنے کی جانب اشارہ کیا ہے۔ "بنے" ایک ثقافتی لفظ ہے جو وہاں کی بول چال میں استعمال ہوتا ہے۔ سانولی چلتے ہوئے کانٹوں سے بچتی، جبکہ زندگی میں بہت سے کانٹے تھے۔اسی طرح وہاں سلام کرنے کا طریقہ بھی عام لوگوں سے جدا ہے۔ جیسے:

"سانولی یہ بڑے خان ہیں۔ ہمارے بڑے بھائی، انہیں سلام کرو۔ سانولی نے وہیں کھڑے کھڑے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔ شاید صحرائی قبائل کے سلام کرنے کا یہی طریقہ تھا۔"(۲۹)

دوسری جانب راجگی کا ثقافتی ماحول یوں ہے۔

"شہباز خان تم راجگی کے وقار کو اچھی طرح جانتے ہو۔ یہ کوئی دارلامان نہیں ہے۔اس تاریخی حویلی میں کسی بیچ لڑکی کو کیسے رکھا جاتا ہے۔۔ہم میں سے کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ اس گھر کے بزرگوں کی صدیوں کی بنائی ہوئی عزت اور وقار کو مٹی میں ملادیں۔"(۳۰)

ارشد نے ثقافتی تراکیب کا استعمال بر محل کیا ہے۔

ہر انسان اپنے پیش نظر ضابطوں کا اطلاق کرتا ہے۔ کوئی بھی انسان ان ضابطوں سے قطع نظر کر کے معاشرے اور فطرت کی تفریق مٹا کر انہیں ایک کرنا ہوگا۔انسانیت کا بھی تقاضا یہی ہے کہ وہ فطرت اور معاشرے میں امتیاز نہ کرے۔ان کا اختلاف دراصل انسانیت کے منافی ہے۔ڈیکولا کے نزدیک انسانوں اور غیر انسانوں میں

رابطے کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ اگر انسان غیر انسانوں کے ساتھ ہمدردانہ سلوک روا نہیں رکھتا تو ماحولیات متاثر ہونے کا شدید اندیشہ ہے۔ مادی و غیر مادی اجتماعات آخر کون سے عوامل سے مربوط و پیوست ہیں۔ ان کے درمیان تضادات اور مشابہت کے عمل کے بشری تقاضوں کو جاننا بہت ضروری ہے۔

سترھویں اور اٹھارہویں صدی میں یورپی مفکرین نے نظریات پیش کئے۔ مینڈے سے مارکس تک فطرت اور ثقافت کے متعلق نظریات کا متنوع انداز ملتا ہے۔ جو ماحولیاتی عناصر پر مغربی فکر کو ہی اجاگر کرتے ہیں۔ عصرِ حاضر میں بھی مغرب ان حقیقتوں کو غیر معمولی نہیں سمجھتا۔ اسے بھی یہ احساس ہے کہ ماحولیاتی تباہی فطرت میں تبدیلی کے سبب کسی بھی وقت سر اٹھا سکتی ہے۔

ڈیکولا اس امر پر زور دیتا ہے کہ یہ عالمگیری و آفاقی دائرہ کار مشترکہ امکان اور بنیادی تاثرات کے بموجب انسانوں پر مسلط ہو رہا ہے۔ فطرت، سماج، ماحول، ثقافت، خود مختاری، حکومتی قوانین، قبائل، ذات پات سبھی اکائی کی صورت میں کام کرتے ہیں۔ سب کا انحصار ایک دوسرے پر ہے۔ مغرب انہیں مخصوص نظریات کی بنا پر جدا کرتا ہے، جبکہ علم موجودات اور علم بشریات میں یہ تمام عوامل انسان پر گہرا اثر مرتب کرتے ہیں۔

ڈیکولا کے نزدیک اب وہ وقت ہے جب ہم دنیا کو انسان اور غیر انسان دونوں کے لئے نفع بخش بنا سکتے ہیں۔ اس کائنات کو فطرتی و ثقافتی ماحولیات کے سبب دوبارہ تشکیل کریں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ادبی متون کا سائنٹفک بنیادوں پر مظالعہ و تجزیہ اس طور ہو کہ شناختوں اور رابطے کے اصولوں کو مدِ نظر رکھا جائے۔

حوالہ جات

ا۔ سلیمان ندوی، سید، خطبات مدراس، ادارہ مطبوعات طلبہ، لاہور، مئی 1995ء، ص99

2. Philippe Des cola ,Modes of being and forms of predication،translation, HAU:Journal of ethnographic theory 4 (1),2014,page 271
3. Ingold, Tim. 1997. “Life beyond the edge of nature? Or, the mirage of society.” In The mark of the social: Discovery or invention?, edited by John D. Greenwood, 231–52. Lanham, MD: Rowman & Littlefield
4. Philippe Des cola ,Modes of being and forms of predication, page 273

۵۔ اورنگ زیب نیازی، ڈاکٹر، ماحولیاتی تنقید: نظریہ اور عمل، اردو سائنس بورڈ، لاہور، 2019ء ص185

6. Philippe Des cola ,Modes of being and forms of predication, page 275
7. Do, page 275
8. Do, page 275
9. Do, page 276
10. Do, page 276

۱۱۔ محمد ہاشم قریشی، ڈاکٹر، انسان اور اس کا ماحول، فاونڈیشن فار ایجوکیشنل ڈولپ منٹ، نئی دہلی، 1993ء، ص5

12. Do page 277
13. Do page 277
14. Caralyn zehnder,charistine mutiti,introduction to environmental sciences,galilo , university system of Georgia, Georgia,2018, page 11

15۔ صدیق الرحمان قدوائی، ادب، ثقافت اور دانشوری، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی، 2007ء، ص9
16۔ ارشد چہال، دھندلے کوس، تعارف، آصف محمود، دوست پبلیکیشنز، اسلام آباد، 1998ء، ص5
17۔ مظفر حسن ملک، ڈاکٹر، ثقافتی بشریات، ص195
18۔ ارشد چہال، دھندلے کوس، ص10
19۔ ایضاً، ص11
20۔ مرکز، روزنامہ (ادبی دنیا)، اسلام آباد، راولپنڈی، اکتوبر، 1998، 6، ص84
21۔ ارشد چہال، دھندلے کوس، ص112، 111
22۔ ایضاً، ص46
23۔ ایضاً، ص36
24۔ ابو سعید قریشی، عناصر تہذیب، مکتبہ اردو، لاہور، 1940ء، ص72
25۔ ارشد چہال، دھندلے کوس، ص51
26۔ ایضاً، ص56
27۔ روزنامہ پاکستان، اسلام آباد، جون، 8،، 1998 ءب، ص54
28۔ ارشد چہال، دھندلے کوس، ص128
29۔ ایضاً، ص99
30۔ ایضاً، ص101